مجروح سلطان پوری

راجندر سنگھ بیدی کے نام

«کہا جو کچھ تو ترا حسن ہو گیا محدود»

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

تعارف

مجروح سے میری پہلی ملاقات سنہ ۱۹۴۵ع میں ہوئی جب وہ انجمن ترقیٔ اردو کی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے جگر مرادآبادی کے ساتھہ بمبئی آئے تھے۔ رات کو مشاعرہ تھا۔ جب مجروح کے نام کا اعلان ہوا تو مجمع نے ذرا ضرورت سے زیادہ تالیاں بجائیں۔ کچھہ لوگ ہنسے۔ لیکن مجروح نے اپنی غزل چھیڑ دی اور ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ تالیاں بجانے والے اور ہنسنے والے شرمندہ ہوگئے۔ شاعر کی خوداعتمادی نے میدان جیت لیا۔ شاعر خوشگو بھی تھا اور خوش گلو بھی۔ خوش پوش بھی اور خوش رو بھی۔ سونے پر سہاگا۔ جگر خوش ہوئے اور مولانا حسرت موہانی نے جی کھول کر داد دی۔

اس وقت مجروح کو ترقی پسندی کے مسلک سے اتفاق نہیں تھا۔ مجروح کی غزلوں میں زندگی تھی اور کہیں کہیں سماجی تنقید بھی جھلک آتی تھی لیکن وہ ادب اور آرٹ کے سماجی مقصد کے قائل نہیں تھے۔

دو برس بعد حیدرآباد کے ایک مشاعرے میں پھر بھی

میرا اور مجروح کا ساتھہ ہوا. وہاں سے ہم اجنٹا اور ایلورا دیکھنے گئے. اجنٹا میں گوتم بدھہ کی تعلیمات، زندگی اور اس وقت کے ماحول کی تصویر کشی نے مجروح کو ششدر کردیا اور انہوں نے چپکے سے مجھہ سے اعتراف کیا کہ سماجی مقصد کے بغیر بڑا آرٹ پیدا نہیں ہو سکتا. مجروح کے الفاظ میں «اجنٹا فن کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے پھر بھی پروپگنڈہ ہے. وہ جاوداں اس لئے ہے کہ اس نے روح عصر کو اسیر کر لیا ہے». یہی خیال بعد کو ایک مقطع میں ڈھل گیا:

نوا ہے جاوداں مجروح جس میں روحِ ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

اس احساس نے مجروح کی شاعری میں ایک انقلاب برپا کردیا اور مجروح نے اپنی غزل کو نئے راستے پر ڈال دیا.

غزل میں اس تبدیلی کی کوشش نئی نہیں ہے. یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اردو غزل محض فارسی کی نقالی ہے. حالانکہ نقالی کی گئی ہے لیکن اردو غزل نے بحیثیت مجموعی اپنا الگ راستہ بنایا ہے جس پر اساتذہ کا کلام شاہد ہے، میر اور غالب خصوصیت کے ساتھہ.

بیچ میں ایک انحطاطی دور آیا جو در اصل جاگیرداری
انحطاط کا بدرو تھا اور انیسویں صدی کے نوابی لکھنؤ میں
بہا. اس ابتذال سے حسرت موہانی نے غزل کو باھر نکالا
اور اسے «عشق پاکباز» کی سطح پر پہونچا دیا. موجودہ
زمانے میں جن شعرا نے خاص طور سے غزل کو سنوارا ھے
ان میں اقبال، جوش، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری،
معین احسن جذبی، فیض احمد فیض اور مجروح سلطانپوری کے
نام سب سے زیادہ روشن ھیں. مجروح اس سلسلے کی آخری
اور سب سے چھوٹی کڑی ھیں. لیکن وہ جس سلسلے کی کڑی
ھیں وہ ان کے مستقبل کا ضامن ھے.

مجروح کو اس پر اصرار ھے اور وہ اپنی ھر نئی غزل میں
اس کو ثابت کر دیتے ھیں کہ موجودہ زمانے کے مسائل کو
شاعرانہ روپ دینے کے لئے غزل ناموزوں نہیں ھے اور کچھ
ایسی منزلیں بھی ھیں جہاں صرف غزل ساتھ دیتی ھے. انقلاب
چین کے بعد جب کسی نے ماؤزے تنگ سے بعض پرانی فنی
ھیئتوں کے بارے میں دریافت کیا کہ انھیں باقی رکھنا چاھئے
یا نہیں، تو ماؤ نے بڑا بلیغ جواب دیا «باغ میں طرح طرح

کے پھول کھلنے دو ، (یہ واقعہ مجھ سے احمد عباس نے بیان کیا ھے) . ھر صنف سخن اور ھر ھیئت ایک خوبصورت پھول ھے اور ایک پھول کی جگہ دوسرا پھول نہیں لے سکتا اور نہ کوئی تنہا پھول چمن بن سکتا ھے .

مجروح کے پھول کا رنگ سرخ ھے اور بہت شوخ سرخ ھے . اور اس کو یہ شوخی شاعر کے خون جگر نے دی ھے . اور یہ پھول ترقی پسند ادب کے باغ میں مہک رھا ھے .

مجروح نے اپنی غزل کو نئے خیالات اور احساسات اور سماجی کشمکش اور انقلاب کے اظہار کا ذریعہ بنایا ھے اور ان کی کامیابی کا اندازہ آپ کو ان کی غزلیں پڑھ کر ھی ھوگا . لطیف ، حسین ، بھرپور ، اور اس خاندان کے سیکڑوں الفاظ اس لذت کو کاغذ پر منتقل کرنے سے قاصر ھیں جو آپ کو غزلیں پڑھنے کے بعد حاصل ھوگی . میں کیا کوئی بھی شعر ، شکر ، یا شراب کی لذت کو بیان نہیں کر سکتا . وہ تو چکھی جاتی ھے . ھاں صرف اس کے اجزاء ترکیبی بتا کر شوق کی آگ کو تیز کیا جا سکتا ھے .

سب سے پہلے عشق ھی کے موضوع کو لیجئے جو ابدی

سمجھا جاتا ھے. مجروح کے یہاں اس کا روپ اس اعتبار سے نیا ھے کہ انہوں نے معشوق کو دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح رفیق زندگی اور رفیق سفر بنا کر پیش کیا ھے:

مجھے سہل ھوگئیں منزلیں وہ ھوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ھاتھہ ھاتھہ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

اس تصویر کے پیچھے سماجی شعور کا ایک کارواں ھے. اس طرح مجروح نے عشق کو اپنے ترقی پسند شعور کا رنگ دے کر مزید زندگی دی ھے.

مجروح نے اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتی خوشیوں اور ذاتی غموں کو سماجی زندگی کی خوشیوں اور غموں کے سمندر میں ملا دیا ھے. اور پھر اس سمندر سے اپنی شاعری کے جام بھرے ھیں. یہی وجہ ھے کہ مجروح کا ھر شعر بیک وقت ان کے اپنے دل کی آواز بھی ھے اور زمانے کے دل کی دھڑکن بھی. ھر اچھی شاعری کے لئے یہ ضروری ھے کہ اس میں بات سب کی نکلتی ھو لیکن انداز شاعر کا ھو. یہی وہ انفرادیت اور اجتماعیت ھے جو شاعر کو عظمت بخشتی ھے. مجروح کے یہاں آپ کو ایسے بہت سے موضوعات مل جائیں گے جن کو آجکل

کے قریب قریب ہر شاعر نے کہا ھے. وہ موضوعات آج اس طرح چھائے ہوئے ھیں کہ غیر ترقی پسند شاعر بھی ان سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ھیں. لیکن جب مجروح نے انہیں ھاتھہ لگایا تو ان پر اپنی مہر ثبت کردی:

آتی ھی رھی ھے گلشن میں ایک بھی بہار آئی ھے تو کیا
ھے یوں کہ قفس کے گوشوں سے اعلان بہاراں ہونا تھا

میں تو جب مانوں کہ بھردے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وھی پیرِ مغاں بنتا گیا

غزل کی رمزیت اور مجروح کی شدت احساس نے ایک وقتی موضوع میں گہرائی پیدا کرکے اسے دیرپا جذبہ میں تبدیل کردیا ھے.

ایک اور خصوصیت جو مجروح کو عام غزل گو شعرا سے ممتاز کرتی ھے یہ ھے کہ انہوں نے سماجی اور سیاسی موضوعات کو بڑی کامیابی کے ساتھہ غزل کے پیرایہ میں ڈھال لیا ھے. عام طور سے غزل گو شعرا سماجی اور سیاسی موضوعات کے بیان میں پھیکے اور سیٹھے ہو جاتے ھیں یا ان کا انداز بیان ایسا ہو جاتا ھے کہ نظم اور غزل کا فرق باقی نہیں رھتا. مجروح کے یہاں یہ بات نہیں ھے. پھر وہ غزل کے مخصوص الفاظ

کے ذخیرہ میں نئے الفاظ کا اضافہ کرتے ہوئے بھی نہیں
گھبراتے ھیں. انہوں نے اپنی مخصوص خوداعتمادی کے ساتھہ
جہاں ضرورت سمجھی ھے ایسے نئے الفاظ بھی استعمال کرلئے
ھیں جو نظموں میں تو آسانی سے کھپ جاتے ھیں لیکن غزل
کو خراب کردیتے ھیں. مجروح نے ان کی مدد سے نئی
تصویریں بنائی ھیں اور غزل کو نیا حسن دیا ھے اور اس کے
طریقۂ اظہار میں اضافہ کیا ھے. مثلاً:

جبیں پر تاج زر، پہلو میں زنداں، بینك چھاتی پر
اٹھیگا بے کفن کب یہ جنازہ ہم بھی دیکھیں گے

اب زمین گائیگی هل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ھر طرف ترانے سے
اھل دل اگائیں گے خاك سے مہ و انجم
اب گہر سبك ھوگا جو کے ایك دانے سے
من چلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراھن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

ان اشعار میں مجروح کی غزل کا ایك دوسرا پہلو بھی نمایاں
ھوتا ھے. اچھے فن کے لئے محض منفی جذبہ کافی نہیں ھے.

مثبت قدروں کی تخلیق بھی ضرری ہے جو حال کا رشتہ مستقبل سے جوڑتی ہیں اور زمانے کے تسلسل کو ادب میں منتقل کردیتی ہیں

مجروح کو اس طرح کی شاعری کرنے کی سزا بھی ملی اور انہیں ایک سال جیل میں گذارنا پڑا. اس ایک سال میں انہیں کئی ہزار روپئے کا نقصان ہوا لیکن ساتھہ ہی لاکھوں کا فائدہ بھی ہوگیا، بلکہ ایسا فائدہ جس کی کوئی قیمت ادا نہیں کی جاسکتی، یعنی ان کی شاعری پر دھار آ گئی. غزل کی تلوار میں یہ دھار شاذ و نادر ہی ملتی ہے. مجروح کے علاوہ صرف فیض اور جذبی کے چند نئے اشعار میں یہ دھار نظر آتی ہے، جیسے:

شریک محفل دار و رسن کچھہ اور بھی ہیں
ستمگرو! ابھی اهل کفن کچھہ اور بھی ہیں — جذبی

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھدی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے — فیض

جیل میں رہ کر مجروح نے غزل کو وہ مجاہدانہ انداز بخشا ہے جس نے اسے موجودہ زمانے کے طوفانی مزاج کے سانچے

میں ڈھال دیا ہے:

دشمن کی دوستی ہے اب اہل وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ
سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

دست منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی
بول کچھ بول مقید لب اظہار سہی
سرِ ممبر نہیں ممکن تو سرِ دار سہی
آنے دے باغ کے غدار مرا روز حساب
مانگے تنکا نہ ملےگا یہی گلزار سہی

مجھے معلوم ہے کہ غزل کے رسیا اس موضوع اور انداز بیان کو کچھ زیادہ پسند نہیں کریں گے لیکن میں یہی کہوں گا کہ اللہ کرے اس تلوار کی دھار اور تیز ہو اور مجروح کے دل میں اس کو اٹھانے کی ہمت اور بڑھتی جائے۔ کیونکہ اس تغزل میں اس عظیم شاعری کا آھنگ ہے جو اس طرح گرج چکی ہے:

گریزد از صف ما هرکه مرد غوغا نیست
کسی که کشته نه شد از قبیلهٔ ما نیست

مجروح کو بڑا شاعر بننے کے لئے اس آهنگ کو اور زیادہ بلند کرنا ھے، اور یہ ھو کے رھے گا، کیونکہ دور وسطی کے شعرا نے جس جنگ کی ابتدا کی تھی آج کے ترقی پسند شاعر اس کی انتہا کر رھے ھیں. ان کی لڑائی جاگیرداری ذھنیت کے خلاف تھی، ھماری لڑائی جاگیرداری اور سامراجی ذھنیت کے خلاف ھے، اس لئے ھم کو اپنی نوا اور زیادہ تلخ و تیز کرنی پڑتی ھے.

یہ منتخب مجموعہ مجروح کے شاعرانہ سفر کی ابتدا ھے. پہلی منزل انہوں نے بڑی خوبصورتی اور کامیابی سے طے کی ھے. اب نئی منزلیں ان کا انتظار کر رھی ھیں. ان کے گرد و پیش بکھرے ھوئے ھزاروں موضوع مجروح کے تغزل کا لباس پہننے کے لئے بیتاب ھیں. ھزاروں نا آفریدہ نغمے تلوار بننے کے لئے تڑپ رھے ھیں.

بمبئی جنوری سنہ ۱۹۵۳ع — سردار جعفری

پیش لفظ

ہندوستان کی نوجوان نسل کے آتش خانے سے جو چنگاریاں نکل رہی ہیں ان میں ایك بہت روشن چنگاری مجروح سلطان پوری ہیں جنہوں نے تغزل کے وجدان میں اپنی بیتاب روح کو عریاں کیا ہے. ان کا شمار ان ترقی پسند شعرا میں ہے جو کم کہتے ہیں اور (شاید اسی لئے) بہت اچھا کہتے ہیں. غزل کے میدان میں انہوں نے وہ سب کچھه کہا ہے جس کے لئے بعض ترقی پسند شعرا صرف نظم کا ہی پیرایہ ضروری اور ناگزیر سمجھتے ہیں. صحیح طور پر انہوں نے غزل کے قدیم شیشہ میں ایك نئی شراب بھر دی ہے. چنانچہ اپنے کلام کے اس مجموعہ کو بھی وہ اپنے اس بے محابا اشارے سے شروع کرتے ہیں کہ

قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تك ہے

میں ان چند سطروں میں «بادۂ شبانہ» کی ان ساری «سر مستیوں» کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا جو مجروح کی غزل کے پیرایہ میں

زندگی کی حقیقتیں پیش کرتی ھیں اور تغزل کے رمز و کنایہ میں وہ سب کچھہ سامنے لاتی ھیں جو کوئی ترقی پسند شاعر کہنا چاھیگا. اس حقیقت کو پڑھنے والوں کے ذوق سلیم کے لئے چھوڑ دیتا ھوں. مگر ایك بات میں کہنا چاھتا ھوں، شعر شاعر کی شخصیت سے جدا نہیں ھوتا اور اگر ھو تو پھر شعر شاعر سے اور شاعر شعر سے بہت دور ھو جاتا ھے. وجدان میں ایسا تصنع پیدا ھوجاتا ھے جو ارباب ذوق کی طبیعت پر گراں گذرتا ھے. مجروح نے اپنے اشعار میں اپنی فطرت کا صحیح عکس پیش کیا ھے. خدا جانے غالب نے کس ماحول میں کہا تھا کہ:

ھر چند ھو مشاھدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ھے بادہ و ساغر کہے بغیر

لیکن مجروح نے اپنے بادہ و ساغر میں جس مشاھدۂ حق پر گفتگو کی ھے اس کا رشتہ زندگی کے حاضر حقائق سے بہت استوار ھے. شاعر جس ماحول سے متاثر ھوتا ھے اسی کا عکس اس کے کلام میں پیدا ھوتا ھے. مجروح اپنے افکار میں بزم کو رزم سے ملا دیتے ھیں اور تقلید سے بچکر اپنی

محفل الگ آراستہ کرتے ھیں:

شمع بھی اجالا بھی میں ھی اپنی محفل کا
میں ھی اپنی منزل کا راھبر بھی راھی بھی

یہ انفرادیت مجروح کے مقام کو بلند کرتی ھے لیکن اس انفرادیت کا نتیجہ یہ نہیں ھوتا کہ ان کا رشتہ زندگی کے حقایق سے قایم نہ رھے۔ وہ تو قایم رھتا ھے، صرف انداز بیان بدلا ھوا ھوتا ھے:

وھی بات جو وہ نہ کہہ سکے میرے شعر و نغمے میں آگئی
وھی لب نہ میں جنہیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

اس انفرادیت کے اکثر دلچسپ پہلو مجروح کی شخصیت میں نمایاں ھیں لیکن ان کے کلام کا حسن یہ ھے کہ جب ان کی انفرادیت کوئی دعوی کرتی ھے تو وہ شیخی اور گھمنڈ کی آلودگی سے پاك ھوتا ھے، مثلا:

میں اکیلا ھی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھہ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یا: دھر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

یہ خودستائی نہیں ہے بلکہ خوداعتمادی ہے۔ مجروح کے کلام کا یہی حسن ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے، اور ان لوگوں کو بھی اپنی طرف کھینچتا ہے جو مجروح سے اور ان کی انفرادیت سے کچھہ واقف ہو گئے ہیں۔ ان کی شاعری کی قدریں، اور کسی بھی انفرادیت دوست شاعر کی قدریں، عام پیمانہ سے ناپی اور تولی نہیں جا سکتیں۔

مجروح ان نوجوان دانشمندوں میں ہیں جن کے سامنے فکر و نظر کے مستقبل کا میدان وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کی منزل کتنی دور ہے، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن ان کے عزم سفر پر مجھے اعتماد ہے۔

علی گڈھ، ۲۷ جنوری ۱۹۵۳ محمد عبدالغفار

•

پندارِ تمنا ٹوٹ کے بھی دل کا کوئی عالم کیا ہوگا
جو تابِ سکوں تک لا نہ سکے وہ دردِ مجسم کیا ہوگا

ہم اپنا مداوا ڈھونڈھ چکے دریاؤں میں صحراؤں میں
تم بھی جسے تسکیں دے نہ سکے وہ درد جنوں کم کیا ہوگا

گو خاکِ نشیمن پر اب بھی ہیں گریہ کناں اربابِ چمن
جب برق تڑپ کر ٹوٹی تھی اس وقت کا عالم کیا ہوگا

جس شوخ نظر کی محفل میں آنسو بھی تبسم بن جائے
واں شمع جلائی جائیگی پروانے کا ماتم کیا ہوگا

اب اپنی نظر ہے بے معنی مفہومِ تمنا کچھ بھی نہیں
جب عشق بھی تھا کچھ چیں بہ جبیں اب حسن بھی برہم کیا ہوگا

«مجروح» مرے ارمانوں کا انجام شکستِ دل ہی سہی
جی کھول کے خود پر ہنس نہ سکوں اتنا بھی مجھے غم کیا ہوگا

سنہ ۱۹۴۳ع

•

مسرتوں کو یہ اہلِ ہوس نہ کھو دیتے
جو ہر خوشی میں ترے غم کو بھی سمو دیتے

کہاں وہ شب کہ ترے گیسوؤں کے سائے میں
خیالِ صبح سے پھر آستیں بھگو دیتے

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لئے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

جو دیکھتے مری نظروں پہ بندشوں کے ستم
تو یہ نظارے مری بے بسی پہ رو دیتے

کبھی تو یوں بھی امنڈتے سرشکِ غم «مجروح»

کہ میرے زخمِ تمنا کے داغ دھو دیتے

سنہ ۱۹۴۴ ع

●

یہ رکے رکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں

یونہی کب تلک خدایا غمِ زندگی نباہیں

کہیں ظلمتوں میں گھرکر ہے تلاشِ دستِ رہبر

کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں

ترے خانماں خرابوں کا چمن کوئی نہ صحرا

یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ

تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں بانہیں

سنہ ع ۱۹۴۴

•

نگاہِ ساقیٔ نامہرباں یہ کیا جانے
کہ ٹوٹ جاتے ہیں خود دل کے ساتھ پیمانے

ملی جب ان سے نظر بس رہا تھا ایک جہاں
ہٹی نگاہ تو چاروں طرف تھے ویرانے

حیات، لغزشِ پیہم کا نام ہے ساقی
لبوں سے جام لگا بھی سکوں خدا جانے

وہ تک رہے تھے، ہمیں ہنس کے پی گئے آنسو
وہ سن رہے تھے، ہمیں کہہ سکے نہ افسانے

تبسموں نے نکھارا ہے کچھ تو ساقی کے
کچھ اہلِ دل کے سنوارے ہوئے ہیں میخانے

یہ آگ اور نہیں، دل کی آگ ہے ناداں
چراغ ہو کہ نہ ہو، جل بجھینگے پروانے

فریبِ ساقیء محفل نہ پوچھئے «مجروح»
شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیمانے

سنہ ۱۹۴۵ ع

دو شعر

تری چشمِ شوخ کو کیا ہوا نہیں ہوتی آج حریفِ دل
مرے زعمِ عشق کی خیر ہو یہ کسے نظر سے گرا دیا

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ جلا دیا کبھی اک چراغ بجھا دیا

•

کوئی آتش در سبو شعلہ بجام آ ہی گیا
آفتاب آ ہی گیا ماہِ تمام آ ہی گیا

محتسب! ساقی کی چشمِ نیم وا کو کیا کروں
میکدے کا در کھلا گردش میں جام آ ہی گیا

اك ستمگر تو کہ وجہِ صد خرابی تیرا درد
اك بلاکش میں کہ تیرا درد کام آ ہی گیا

ہم قفس! صیاد کی رسمِ زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی اندازِ کلام آ ہی گیا

کیوں کہوں گا میں کسی سے تیرے غم کی داستاں
اور اگر اے دوست لب پر تیرا نام آ ہی گیا

آخرش «مجروح» کے بے رنگ روز و شب میں وہ
صبحِ عارض پر لئے زلفوں کی شام آ ہی گیا

سنہ ۱۹۴۵ ع

دو شعر

کس کس کو ہائے تیرے تغافل کا دوں جواب
اکثر تو رہ گیا ہوں جھکا کر نظر کو میں

اللہ رے وہ عالمِ رخصت کہ دیر تک
تکتا رہا ہوں یونہی تری رہگذر کو میں

•

ختم شورِ طوفاں تھا دور تھی سیاھی بھی

دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباھی بھی

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو

رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاھی بھی

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں

نغمۂ سحر بھی ھے آہِ صبح گاھی بھی

یاد کر وہ دن جس دن تیری سخت گیری پر

اشک بھر کے اٹھی تھی میری بے گناھی بھی

پستیٔ زمیں سے ھے رفعتِ فلک قائم

میری خستہ حالی سے تیری کج کلاھی بھی

شمع بھی اجالا بھی میں ھی اپنی محفل کا
میں ھی اپنی منزل کا راھبر بھی راھی بھی

گنبدوں سے پلٹی ھے اپنی ھی صدا «مجروح»
مسجدوں میں کی میں نے جا کے داد خواھی بھی

سنہ ۱۹۴۵ ع

دو شعر

مہ و خورشید بھی ساغر بکف ھوکر اتر آئے
بوقتِ بادہ نوشی جب نچوڑی آستیں میں نے

وہ بعدِ عرضِ مطلب، ھائے رے شوقِ جواب اپنا
کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنیں میں نے

●

ختم شورِ طوفاں تھا دور تھی سیاھی بھی
دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباھی بھی

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاھی بھی

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ھے آہِ صبح گاھی بھی

یاد کر وہ دن جس دن تیری سخت گیری پر
اشک بھر کے اٹھی تھی میری بے گناھی بھی

پستیء زمیں سے ھے رفعتِ فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کج کلاھی بھی

شمع بھی اجالا بھی میں ھی اپنی محفل کا

میں ھی اپنی منزل کا راھبر بھی راھی بھی

گنبدوں سے پلٹی ھے اپنی ھی صدا «مجروح»

مسجدوں میں کی میں نے جا کے داد خواھی بھی

سنہ ۱۹۴۵ ع

دو شعر

مہ و خورشید بھی ساغر بکف ھوکر اتر آئے

بوقتِ بادہ نوشی جب نچوڑی آستیں میں نے

وہ بعدِ عرضِ مطلب، ھائے رے شوقِ جواب اپنا

کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنیں میں نے

•

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمے میں آ گئی
وہی لب نہ میں جنہیں چھو سکا قدحِ شراب میں ڈھل گئے

تجھے چشمِ مست پتہ بھی ہے کہ شباب گرمیء بزم ہے
تجھے چشمِ مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

انہیں کب کے راس بھی آ چکے تری بزمِ ناز کے حادثے
اب اٹھے کہ تیری نظر پھرے جو گرے تھے گر کے سنبھل گئے

مرے کام آ گئیں آخرش یہی کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اسقدر مری منزلیں که قدم کے خار نکل گئے

سنه ۱۹٤٦ع

دو شعر

اب سوچتے هیں لائینگے تجھ سا کہاں سے هم
اٹھنے کو اٹھ تو آئے ترے آستاں سے هم

اشکوں میں رنگ و بوے چمن دور تك ملی
جس دم اسیر هو کے چلے گلستاں سے هم

●

آہِ جانسوز کی محرومیء تاثیر نہ دیکھ
ہو ہی جائیگی کوئی جینے کی تدبیر، نہ دیکھ

حادثے اور بھی گذرے تری الفت کے سوا
ہاں! مجھے دیکھ مجھے اب مری تصویر نہ دیکھ

یہ ذرا دور پہ منزل یہ اجالا یہ سکوں
خواب کو دیکھ ابھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ھے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

کچھ بھی ہو پھر بھی دُکھے دل کی صدا هوں ناداں
مری باتوں کو سمجھ تلخیء تقریر نہ دیکھ

وھی «مجروح» وھی شاعرِ آوارہ مزاج
کون اٹھا ھے تری بزم سے دلگیر نہ دیکھ
سنہ ۱۹۴۶ ع

ایک شعر

دل کی تمنا ھے مستی میں منزل سے بھی دور نکلتے
اپنا بھی کوئی ساتھی ھوتا ھم بھی بہکتے چلتے چلتے

ایک شعر

سیاھیاں شبِ فرقت کی ھمنفس مت پوچھ
کسی کو یاد جو کیجئے تو یاد آ نہ سکے

•

لئے بیٹھا ھے دل اک عزمِ بیباکانہ برسوں سے
کہ اس کی راہ میں ھیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے

دلِ سادہ نہ سمجھا، ماسوائے پاکدامانی
نگاہِ یار کہتی ھے کوئی افسانہ برسوں سے

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ھیں اے غمِ جانانہ برسوں سے

مجھے یہ فکر سب کی پیاس اپنی پیاس ھے ساقی
تجھے یہ ضد کہ خالی ھے مرا پیمانہ برسوں سے

ھزاروں ماھتاب آئے ھزاروں آفتاب آئے
مگر ھمدم وھی ھے ظلمتِ غمخانہ برسوں سے

وهی «مجروح» سمجھے سب جسے آوارۂ ظلمت
وهی هے ایك شمعِ سرخ کا پروانه برسوں سے

سنه ۱۹٤۷ ع

ایك شعر

وہ آ رهے هیں سنبھل سنبھل کر نظارہ بیخود فضا جواں هے
جھکی جھکی هیں نشیلی آنکھیں رکا رکا دورِ آسماں هے

ایك شعر

الگ بیٹھے تھے پھر بھی آنکھ ساقی کی پڑی هم پر
اگر هے تشنگی کامل تو پیمانے بھی آئیں گے

•

دور دور مجھ سے وہ اس طرح خراماں ھے
ھر قدم ھے نقشِ دل ھر نگہ رگِ جاں ھے

بن گئی ھے مستی میں دل کی بات ھنگامہ
قطرہ تھی جو ساغر میں لب تک آکے طوفاں ھے

ھم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رھی دنیا کفر ھے کہ ایماں ھے

میرے شکوۂ غم سے عالمِ ندامت میں
اس لبِ تبسم پر شمع سی فروزاں ھے

منتظر ھیں پھر میرے حادثے زمانے کے
پھر مرا جنوں تیری بزم میں غزلخواں ھے

فکر کیا انھیں جب تو ساتھ ھے اسیروں کے
اے غمِ اسیری تو خود شکستِ زنداں ھے

اپنی اپنی ھمت ھے اپنا اپنا دل «مجروح»
زندگی بھی ارزاں ھے موت بھی فراواں ھے

سنہ ۱۹۴۷ ع

ایک شعر

ھٹ کے روئے یار سے تزئینِ عالم کر گئیں
وہ نگاھیں جن کو ابتک رائگاں سمجھا تھا میں

●

ڈرا کے موج و تلاطم سے ہمنشینوں کو
یہی تو ہیں جو ڈبویا کئے سفینوں کو

شراب ہو ہی گئی ہے بقدرِ پیمانہ
بہ عزمِ ترک نچوڑا جب آستینوں کو

جمالِ صبح دیا روی نو بہار دیا
مری نگاہ بھی دیتا خدا حسینوں کو

ہماری راہ میں آئے ہزار میخانے
بھلا سکے نہ مگر ہوش کے قرینوں کو

ق

کبھی نظر بھی اٹھائی نہ سوے بادۂ ناب
کبھی چڑھا گئے پگھلا کے آبگینوں کو

ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں
چراغِ راہ کئے خونچکاں جبینوں کو

تجھے نہ مانے کوئی تجھکو اس سے کیا «مجروح»
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چینوں کو

سنہ ۱۹۴۷ ع

ایک شعر

نہ مٹ سکیں گی یہ تنہائیاں مگر اے دوست
جو تو بھی ہو تو طبیعت ذرا بہل جائے

•

جو سمجھاتے بھی آکر واعظِ برہم تو کیا کرتے
ہم اس دنیا کے آگے اس جہاں کا غم تو کیا کرتے

حرم سے میکدے تک منزلِ یک عمر تھی ساقی
سہارا گر نہ دیتی لغزش پیہم تو کیا کرتے

جو مٹی کو مزاجِ گل عطا کر دیں وہ اے واعظ
زمیں سے دور فکرِ جنتِ آدم تو کیا کرتے

سوال ان کا جواب ان کا سکوت ان کا خطاب ان کا
ہم ان کی انجمن میں سر نہ کرتے خم تو کیا کرتے

جہاں «مجروح» دل کے حوصلے ٹوٹیں نگاہوں سے
وہاں کرتے بھی مرگِ شوق کا ماتم تو کیا کرتے

سنہ ۱۹۴۷ ع

ایک شعر

ھائے وہ ساعت کہ وقفِ شوق تھا ہر ہر نفس

آہ یہ عالم کہ اب تیری تمنا بھی نہیں

ایک شعر

نظارہ ھاے دھر بہت خوب ھیں مگر

اپنا لہو بھی سرخیء شام و سحر میں ھے

●

جو سمجھاتے بھی آ کر واعظِ برہم تو کیا کرتے
ہم اس دنیا کے آگے اس جہاں کا غم تو کیا کرتے

حرم سے میکدے تک منزلِ یک عمر تھی ساقی
سہارا گر نہ دیتی لغزشِ پیہم تو کیا کرتے

جو مٹی کو مزاجِ گل عطا کر دیں وہ اے واعظ
زمیں سے دور فکرِ جنتِ آدم تو کیا کرتے

سوال ان کا جواب ان کا سکوت ان کا خطاب ان کا
ہم ان کی انجمن میں سر نہ کرتے خم تو کیا کرتے

جہاں «مجروح» دل کے حوصلے ٹوٹیں نگاہوں سے
وہاں کرتے بھی مرگِ شوق کا ماتم تو کیا کرتے

سنہ ۱۹۴۷ ع

ایک شعر

ہائے وہ ساعت کہ وقفِ شوق تھا ہر ہر نفس
آہ یہ عالم کہ اب تیری تمنا بھی نہیں

ایک شعر

نظارہ ہاے دہر بہت خوب ہیں مگر
اپنا لہو بھی سرخیٔ شام و سحر میں ہے

5a

•

اب اہلِ درد یہ جینے کا اہتمام کریں
اسے بھلا کے غمِ زندگی کا نام کریں

فریب کھا کے ان آنکھوں کا کب تلک اے دل
شرابِ خام پئیں رقصِ ناتمام کریں

غمِ حیات نے آوارہ کر دیا ورنہ
تھی آرزو کہ ترے در پہ صبح و شام کریں

نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروانِ حیات
یہ قافلے تو بجانے کہاں قیام کریں

غمِ جہاں کو غمِ دل بنا کے کچھ نہ ملا
کہ جس سے زیست کو راحت ملے وہ کام کریں

سکھائیں دستِ طلب کو ادائے بیباکی
پیامِ زیرِ لبی کو صلائے عام کریں

غلام رہ چکے توڑیں یہ بندِ رسوائی
خود اپنے بازوے محنت کا احترام کریں

زمیں کو مل کے سنواریں مثالِ روی نگار
رخِ نگار کی ضو سے فروغِ بام کریں

پھر اٹھ کے گرم کریں کار و بارِ زلف و جنوں
پھر اپنے ساتھ اسے بھی اسیرِ دام کریں

مری نگاہ میں ھے ارضِ ماسکو «مجروح»
وہ سر زمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

سنہ ۱۹۴۸ ع

•

تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ھی تجھے منظور نہیں

آپ اپنا مقدر بن نہ سکے اتنا تو کوئی مجبور نہیں

یہ محفلِ اھلِ دل ھے یہاں ھم سب میکش ھم سب ساقی

تفریق کریں انسانوں میں اس بزم کا یہ دستور نہیں

جنت بہ نگہ تسنیم بہ لب انداز اسکے اے شیخ نہ پوچھ

میں جس سے محبت کرتا ھوں انساں ھے خیالی حور نہیں

وہ کونسی صبحیں ھیں جن میں بیدار نہیں افسوں تیرا

وہ کونسی کالی راتیں ھیں جو میرے نشے میں چور نہیں

سنتے ھیں کہ کانٹے سے گل تک ھیں راہ میں لاکھوں ویرانے

کہتا ھے مگر یہ عزمِ جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

«مجروح» اٹھی ھے موجِ صبا آثار لئے طوفانوں کے

ہر قطرۂ شبنم بن جائے اک جوے رواں کچھ دور نہیں

سنہ ۱۹۴۸ ع

●

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب مانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

٤١

شرحِ غم تو مختصر ھوتی گئی اسکے حضور
لفظ جو منھ سے نہ نکلا داستان بنتا گیا

دھر میں «مجروح» کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

سنہ ۱۹٤۸ ع

•

لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا
ہو کے رہے گی دھرتی اپنی ملک ہمارا ہو کے رہے گا

چین کا نو سنسار تو دیکھو دھرتی کا سنگار تو دیکھو
ایک زمیں کیا لال ابھی ہر ایک ستارا ہو کے رہے گا

قید سے چھوٹا روپ وطن کا تیور دیکھ تلنگانے کے
کھل کے زمیں انگڑائی لے گی عام نظارا ہو کے رہے گا

صدیوں سے ہر ظلم مٹاتے آئے ہیں اور آج کے دن بھی
جیسے ہم چاہیں گے ساتھی ویسے گذارا ہو کے رہے گا

لینن کے پیغام کی جے ہو اسٹالن کے نام کی جے ہو
جے ہو اس دھرتی کی جس پر اپنا اجارہ ہو کے رہے گا

سنہ ۱۹٤۹ ع

●

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے

یہ بھی کوئی ہٹلر کا ھے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

امن و محبت کے سائے میں کھلتے ھیں دل اگتی ھے جوانی

اب نہ اگائے لاش یہ دھرتی جنگ لہو برسانے نہ پائے

صدیوں کے ورگوں سے نکل کر روپ نکھارا ھے انساں نے

مشکل سے سلجھے ھیں جو گیسو کوئی انھیں الجھانے نہ پائے

اپنے ھی سنکٹ کے بھنور میں چکرائی ٹرومین کی نیا

ڈھونڈھتی ھے تنکے کا سہارا تنکا بھی کام آنے نہ پائے

امن ترا جیون کا نغمہ امن اس کا ھے موت کا نغمہ

سرخ ھی گل ھے سرخ لہو بھی آنکھ یہ دھوکا کھانے نہ پائے

•

آخر غمِ جاناں کو اے دل بڑھکر غمِ دوراں ہونا تھا

اس قطرے کو بننا تھا دریا اس موج کو طوفاں ہونا تھا

ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں ابھی فردوس و جناں کے شیدائی

تجھکو تو ابھی کچھ اور حسیں اے عالمِ امکاں ہونا تھا

وہ جس کے گدازِ محنت سے پر نور شبستاں ہے تیرا

اے شوخ اسی بازو پہ تری زلفوں کو پریشاں ہونا تھا

آتی ہی رہی ہے گلشن میں اب کے بھی بہار آئی ہے تو کیا

ہے یوں کہ قفس کے گوشوں سے اعلانِ بہاراں ہونا تھا

آیا ہے ہمارے ملک میں بھی اك دورِ زلیخائی یعنی

اب وہ غمِ زنداں دیتے ہیں جنکو غمِ زنداں ہونا تھا

اب کھل کے کہوں گا ہر غمِ دل «مجروح» نہیں وہ وقت کہ جب

اشکوں میں سنانا تھا مجھکو آہوں میں غزلخواں ہونا تھا

سنہ ۱۹٤۹ ع

●

آ نکل کے میداں میں دو رخی کے خانے سے
کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے

سنتے ہم تو کیا سنتے اک بزرگ کی باتیں
صبح کو علاقہ کیا شام کے افسانے سے

وہ لگا کے سینے سے فلسفہ تصوف کا
شیخ جی حسینوں میں پھرتے ہیں دِوانے سے

خودکشی ہی راس آئی دیکھ بدنصیبوں کو
خود سے بھی گریزاں ہیں بھاگ کر زمانے سے

میں کہ ایک محنت کش میں کہ تیرگی دشمن
صبحِ نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے

سرخ انقلاب آیا دورِ آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے

اب زمین گائیگی ھل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ھر طرف ترانے سے

اھلِ دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
اب گہر سبک ھوگا جو کے ایک دانے سے

منچلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراھن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

عام ھوگا اب ھمدم سب پہ فیض فطرت کا
بھر سکیں گے اب دامن ھم بھی اس خزانے سے

اب جنوں پہ وہ ساعت آ پڑی کہ اے «مجروح»
آج زخمِ سر بہتر دل پہ چوٹ کھانے سے

سنہ ۱۹۴۹ ع

●

ستم کو سرنگوں ظالم کو رسوا ہم بھی دیکھینگے
چل اے عزمِ بغاوت چل تماشا ہم بھی دیکھینگے

ابھی تک تو فقط انجام ہی دیکھا محبت کا
کہاں ہے دورِ آغازِ تمنا ہم بھی دیکھینگے

پلا کر خونِ دل گیتی کو اے شوقِ چمن بندی
کفِ ہر غنچہ میں تقدیرِ صحرا ہم بھی دیکھینگے

فضائے ایشیا پر یہ گھٹا ہے جنگ کی ساقی
بہار آئی تو سوئے جام و مینا ہم بھی دیکھینگے

ق

ابھی تو فکر کر ان دل سے نازک آبگینوں کی
بہ فیضِ امن پھر ساغر میں دریا ہم بھی دیکھینگے

نگارِ چیں کا گھائل توڑتا ہے دم سرِ مقتل
بچالے آکے اعجازِ مسیحا ہم بھی دیکھینگے

جبیں پر تاجِ زر پہلو میں زنداں بینک چھاتی پر
اٹھیگا بے کفن کب یہ جنازہ ہم بھی دیکھینگے

مسلط زندگی پر کب سے ہے زنداں کی تاریکی
نکل اے مہرِ آزادی اجالا ہم بھی دیکھینگے

•

دستِ منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سرِ بازار سہی

بول کچھ بول مقید لبِ اظہار سہی
سرِ منبر نہیں ممکن تو سرِ دار سہی

پھر بھی کہلاؤں گا آوارۂ گیسوے بہار
میں ترا دامِ خزاں، لاکھ گرفتار سہی

آنے دے باغ کے غدار مرا روزِ حساب
مانگے تنکا نہ ملے گا یہی گلزار سہی

جست کرتا ہوں تو لڑ جاتی ہے منزل سے نظر
حائلِ راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

غیرتِ سنگ ھے ساقی یہ گلوی تشنہ

ترے پیمانے میں جو موج ھے تلوار سہی

حل تو ھونا ھے مگر مسئلۂ تشنہ لبی

ساغرِ خشك ابھی عقدۂ دشوار سہی

میں نے دیکھی ھے اسی میں غمِ دوراں کی جھلك

بے خبر رنگِ جہاں سے نگہِ یار سہی

ان سے بچھڑے ھوئے «مجروح» زمانہ گذرا

اب بھی ھونٹوں میں وھی گرمیء رخسار سہی

سنہ ۱۹۵۱ ع
(بائیکلہ جیل بمبئی)

●

ہوں جو سارے دست و پا ہیں خوں میں نہلائے ہوئے

ہم بھی ہیں اے دل بہاراں کی قسم کھائے ہوئے

دیکھ ابرِ جنگ کے دامن کو الجھائے ہوئے

پیچ کھاتے ہیں فضا میں ہاتھ جھنجھلائے ہوئے

خبط ہے اے ہمنشیں عقلِ حریفانِ بہار

ہے خزاں ان کی انھیں آئینہ دکھلائے ہوئے

کیا ہے ذکرِ آتش و ایٹم کہ غدارانِ گل

مارتے ہیں ہاتھ انگاروں پہ گھبرائے ہوئے

کانپ کے سر سے زمیں پر گر پڑا خسرو کا تاج

بڑھ رہا ہے تیشہ زن کوہِ گراں ڈھائے ہوئے

زندگی کی قدر سیکھی شکریہ تیغِ ستم
ہاں ہمیں تھے کل تلک جینے سے اکتائے ہوئے

سیرِ ساحل کر چکے اے موجِ ساحل سر نہ مار
تجھ سے کیا بہلیں گے طوفانوں کے بہلائے ہوئے

ہے یہی اک کاروبارِ نغمہ و مستی کہ ہم
یا زمیں پر یا سرِ افلاک ہیں چھائے ہوئے

ساز اٹھایا جب تو گرماتے پھرے ذروں کے دل
جام ہاتھ آیا تو مہر و مہ کے ہمسائے ہوئے

دشت و در بننے کو ہیں «مجروح» میدانِ بہار
آ رہی ہے فصلِ گل پرچم کو لہرائے ہوئے

سنہ ۱۹۵۱ ع
(بائیکلہ جیل بمبئی)

●

جسدم یہ سنا ہے صبح وطن محبوس فضائے زنداں میں
جیسے کہ صبا اے ہم قفسو بیتاب ہم آئے زنداں میں

ہو تیغ اثر زنجیرِ قدم پھر بھی ہیں نقیبِ منزل ہم
زخموں سے چراغِ راہگذر بیٹھے ہیں جلائے زنداں میں

صد چاک فریبِ امن و سکوں عریاں ہے اہنسائی کا جنوں
کچھ خوں سے شہیدوں نے اپنے وہ گل ہیں کھلائے زنداں میں

یہ جبر سیاست یہ انساں مظلوم آہیں مجبور فغاں
زخموں کی مہک داغوں کا دھواں مت پوچھ فضائے زنداں میں

غیروں کی خلش اپنوں کی لگن سوزِ غمِ جاناں دردِ وطن
کیا کہئے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

گل بنتی ھے شاید خاکِ وطن شاید کہ سفر کرتی ھے خزاں
خوشبوئے بہاراں ملتی ھے کچھ دن سے ھوائے زنداں میں

مجرم تھے جو ھم سو قید ھوئے صیاد مگر اب یہ تو بتا
ہر وقت یہ کس کو ڈھونڈھتے ھیں دیوار کے سائے زنداں میں

ق

جسموں پہ کس کا نامِ سیہ لکھ دیتے ھیں کوڑوں کے نشاں
ھیں تاک میں کس کی زنجیریں اب دام بچھائے زنداں میں

رفتارِ زمانہ لے جن کی، گیتی ھے گلِ نغمہ جن کا
ھم گاتے ھیں ان آوازوں سے آواز ملائے زنداں میں

«مجروح» نے بھی دیکھا اسکو اے کہنہ نظامِ سرمایہ
تیری ھو یہی بنیاد مگر اب کیا ھے بنائے زنداں میں

سنہ ۱۹۵۱ ع
(بائیکلہ جیل بمبئی)

●

دشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ

ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ

اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

بہ کر زمیں پہ ہے ابھی گردش میں خوں مرا

قطرے وہ پھول بنتے ہیں خاکِ وطن کے ساتھ

کس نے کہا کہ ٹوٹ گیا خنجرِ فرنگ

سینے پہ زخمِ نو بھی ہے داغِ کہن کے ساتھ

جھونکے جو لگ رہے ہیں نسیمِ بہار کے

جنبش میں ہے قفس بھی اسیرِ چمن کے ساتھ

ھشیار سامراج! کہ زنجیرِ ایشیا

ٹوٹے گی تیرے سلسلۂ جان و تن کے ساتھ

اے دزدِ مالِ خام! کدالوں کی سرزمیں

کر لے گی تجھکو دفن ترے مکر و فن کے ساتھ

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے

قدوگیسو سے اپنا سلسلہ دارورسن تک ہے

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی

یہ رسمِ قید و زنداں ایک دیوارِ کہن تک ہے

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو

مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں

بلانوشی مری کیا اک مئے ساغرشکن تک ہے

نہ آخر کہہ سکا اس سے مرا حالِ دلِ سوزاں

مہِ تاباں کہ جو اس کا شریکِ انجمن تک ہے

نوا ہے جاوداں «مجروح» جس میں روحِ ساعت ہو

کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

(ارتھر روڈ جیل بمبئی)
سنہ ۱۹۵۱ ع

چھوٹا دیارِ یار تو اب فکرِ یار کیوں

وہ شمعِ انجمن بھی گئی انجمن کے ساتھ

•

باعثِ جلوۂ گل دیدۂ تر ہے کہ نہیں
میری آہوں سے بہاراں کی سحر ہے کہ نہیں

راہ گم کردہ ہوں کچھ اس کو خبر ہے کہ نہیں
اس کی پلکوں پہ ستاروں کا گذر ہے کہ نہیں

میرے ہونٹوں پہ تڑپتے ہیں ابھی تک شکوے
جانے اس کی وہی نیچی سی نظر ہے کہ نہیں

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آکر
سوچتا ہوں یہ تری راہگذر ہے کہ نہیں

تیز ہے دستِ ستم دے بھی شراب اے ساقی
تیغ گردن پہ سہی جام سپر ہے کہ نہیں

روی، مشرق کی قسم ہم کو ہے اتنا معلوم
شبِ دوراں ترے دامن میں سحر ہے کہ نہیں

میں جو کہتا تھا سو اے رہبرِ کوتاہ خرام
تیری منزل بھی مری گردِ سفر ہے کہ نہیں

اہلِ تقدیر! یہ ہے معجزۂ دستِ عمل
جو خزف میں نے اٹھایا وہ گہر ہے کہ نہیں

دیکھ کلیوں کا چٹکنا سرِ گلشن صیاد
زمزمہ سنج مرا خونِ جگر ہے کہ نہیں

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن «مجروح»
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

سنہ ۱۹۵۲ ع

نذر سوویٹ یونین

شمعِ زنداں مجھے، ہر گلبدنِ سرخ ترا
میں تو دیوانہ ہوں اے انجمنِ سرخ ترا

ہوگی تجھ کو تو مری آبلہ پائی کی خبر
آہ یہ دشتِ سیہ وہ چمنِ سرخ ترا

ہوں میں آلودۂ خوں پھر بھی مرا شوق تو دیکھ
اب مرے تن پہ بھی ہے پیرہنِ سرخ ترا

تو بھی دیکھے تو یہ اب ہو نہ سکے گا معلوم
میرے سینے میں ہے دل یا وطنِ سرخ ترا

مژدہ اے صبحِ وطن آ ہی گیا تیغ بکف
وہی «مجروح» وہی نعرہ زنِ سرخ ترا

~~سنہ ۱۹۴۸ع~~

سنہ ۱۹۵۲ ع